

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

پچھلی اشاعت میں صرف ایک انسانی کمزوری: "نفسانیت" کے اثرات و نتائج پر گفتگو کی گئی تھی۔ اب ہم عیوب کے دوسرے بڑے بڑے خاندانوں کا جائزہ لے کر دیکھیں گے کہ وہ نفس انسانی کی کن کمزوریوں سے وجود میں آتے ہیں اور کس طرح اس کو مخراب کرتے ہیں جو انسانیت کی تعمیر و اصلاح کے لیے، خصوصاً اسلام کے لیے ہونے اصول اور نقشہ کار پر کیا جائے۔

ان میں سے ایک پورا خاندان عیوب اس کمزوری سے جنم لیتا ہے جس کے لیے موزوں ترین نام "مزاج کی بے اعتدالی" ہے۔ نفسانیت کے مقابلے میں یہ ایک معصوم نوعیت کی کمزوری ہے، کیونکہ اس میں کسی بدیتی کسی بڑے جذبے، کسی ناپاک خواہش کا دخل نہیں ہوتا۔ لیکن خرابی پیدا کرنے کی قابلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ نفسانیت کے بعد دوسرے نمبر پر آتی ہے؛ بلکہ بسا اوقات اس کے اثرات و نتائج اتنے ہی خراب ہوتے ہیں جتنے نفسانیت کے اثرات و نتائج۔

مزاج کی بے اعتدالی کا فطری نتیجہ نظر و فکر کی بے اعتدالی اور عمل و سعی کی بے اعتدالی ہے، اور یہ چیز زندگی کے حقائق سے براہ راست منصدم ہوتی ہے۔ انسانی زندگی بے شمار تضاد و عداوتوں، مصالحت اور بہت سے مختلف عوامل کے مجموعی عمل کا نتیجہ ہے۔ جس دنیا میں انسان رہتا ہے اس کا بھی یہی حال ہے، انسانی افراد میں تو ہر ایک فرد ابھی ایسا ہی بنا یا گیا ہے، اور انسانوں کے مٹنے سے جو اجتماعی ہیئت بنتی ہے اس کی کیفیت بھی یہی ہے۔ اس زندگی میں کام کرنے کے لیے فکر و نظر کا ایسا توازن، اور سعی و عمل کا ایسا اعتدال درکار ہے جو مزاج و کثرت کے توازن و اعتدال کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو۔ حالات کے ہر پہلو پر نگاہ رکھی جائے۔ معاملات کے ہر رُخ کو دیکھا جائے۔ ضروریات کے ہر گوشے کو اس کا حق دیا جائے۔ فطرت کے

ہر تقاضے کو ملحوظ رکھا جائے۔ کمال درجے کا معیاری اعتدال چاہے نصیب نہ ہو، مگر یہاں کامیابی کے لیے بہر حال اعتدال ناگزیر ہے۔ جتنا بھی وہ معیار سے قریب ہوگا اتنا ہی مفید ہوگا، اور جس قدر وہ اس سے دور ہوگا اسی قدر زندگی کی حقیقتوں سے متصادم ہو کر نقصان کا موجب بنے گا۔ دنیا میں آج تک جتنا بھی نسا درونما ہوا ہے، اور آج رونما ہے، اسی وجہ سے ہے کہ غیر متوازن دماغوں نے انسانی مسائل کو یک رخے پن کے ساتھ دیکھنے اور سمجھنے کی کوششیں کیں، ان کو حل کرنے کے لیے غیر متوازن اسکیمیں بنائیں، اور ان کو نافذ کرنے کے لیے غیر معتدل طریقے اختیار کیے۔ یہی گناہ کا اصل سبب ہے، اور بناؤ کا جو کچھ بھی کام ہو سکتا ہے، فکر و نظر کے توازن اور طریق عمل کے اعتدال ہی سے ہو سکتا ہے۔

یہ وصف خاص طور پر تعمیر و اصلاح کی اس اسکیم کو نافذ کرنے کے لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے جو اسلام نے ہمیں دی ہے، کیونکہ وہ بجائے خود توازن و اعتدال کے انتہائی کمال کا نمونہ ہے۔ اس کو کتابوں کے صفحات سے واقعات کی دنیا میں منتقل کرنے کے لیے تو خصوصیت کے ساتھ دسی کار فرما اور کارکن مزدور ہو سکتے ہیں جن کی نظر اسلام کے نقشہ تعمیر کی طرح متوازن اور جن کا مزاج اسلام کے مزاج اصلاح کی طرح معتدل ہو۔ افراط و تفریط میں مبتلا ہونے والے انتہا پسند لوگ اس کام کو گناہ ٹور سکتے ہیں، بنا نہیں سکتے۔

نتیجے کے اعتبار سے بے اعتدالی کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ وہ بالعموم ناہمی کی موجب ہوتی ہے۔ نظام زندگی میں اصلاح و تعمیر کی کوئی اسکیم بھی لے کر آپ اٹھیں، آپ کی کامیابی کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ آپ خود اس کے برحق ہونے پر مطمئن ہوں، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اپنے معاشرے کے عام انسانوں کو اس کے صحیح، مفید اور قابل عمل ہونے پر مطمئن کریں، اور اپنی تھریک کو اس شکل میں لائیں اور ایسے طریقے سے چلائیں جس سے لوگوں کی امیدیں اور نسبتیں اس کے ساتھ وابستہ ہوتی چلی جائیں۔ یہ بات صرف اسی تھریک کو نصیب ہو سکتی ہے جو نظر و فکر میں بھی متوازن ہو اور طریق عمل میں بھی متوازن ایک انتہا پسندانہ اسکیم، جو انتہا پسندانہ طریقوں سے چلائی جائے، عام انسانوں میں اپنے لیے رغبت اور امید پیدا کرنے کے بجائے نفرت اور مایوسی پیدا کرتی ہے، قابل اور مطمئن کرنے کے بجائے معتزل اور

غیر مطمئن بنتی ہے، اور اس کی یہ صفت خود ہی اس کی قوت تبلیغ اور قوت نفوذ کو ضائع کر دیتی ہے۔ اس کو بنانے اور چلانے کے لیے کچھ انتہا پسند لوگ اکٹھے ہو بھی جائیں تو سارے معاشرے کو اپنے جیسا انتہا پسند بنالینا اور دنیا بھر کی آنکھیں حقائق سے بند کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

خود اس جماعت کے لیے بھی یہ چیز زہر کا حکم رکھتی ہے جو اجتماعی اصلاح و تعمیر کا کوئی پروگرام لے کر اٹھی ہو۔

مزاج کی بے اعتدالی کا اولین مظہر انسان کے ذہن کا ایک رخ پائین ہے۔ اس کیفیت میں مبتلا ہو کر آدمی بالعموم ہر چیز کا ایک رخ دیکھتا ہے، دوسرا رخ نہیں دیکھتا۔ ہر معاملے میں ایک پہلو کا کاٹا کرتا ہے، دوسرے کسی پہلو کا کاٹا نہیں کرتا۔ ایک سمت جس میں اس کا ذہن ایک دفعہ چل پڑتا ہے اسی کی طرف وہ بڑھتا چلا جاتا ہے، دوسری سمتوں کی جانب توجہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس سے معاملات کو سمجھنے میں سلسل ایک خاص طرح کے عدم توازن کا ظہور ہوتا ہے۔ رائے قائم کرنے میں بھی وہ ایک ہی طرف جھکتا چلا جاتا ہے۔ جس چیز کو اہم سمجھ لیتا ہے بس اسی کو یکڑ بیٹھتا ہے، دوسری ویسی ہی اہم چیزیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم چیزیں اس کے نزدیک غیر واقع ہو جاتی ہیں۔ جس چیز کو بڑا سمجھ لیتا ہے اسی کے پیچھے پڑ جاتا ہے، دوسری ٹھسی ہی بلکہ اس سے زیادہ بڑی برائیاں اس کے نزدیک قابل توجہ نہیں ہوتیں۔ اصولیت اختیار کرتا ہے تو جمود کی حد تک اصول پرستی میں شدت دکھانے لگتا ہے، کام کے عملی تقاضوں کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ عملیت کی طرف جھکتا ہے تو بے اصولی کی حد تک عملی بن جاتا ہے اور کامیابی کو مقصود بالذات بنا کر اس کے لیے ہر قسم کے وسائل و ذرائع استعمال کر ڈالنا چاہتا ہے۔

یہ کیفیت اگر اس حد پر نہ رک جائے تو آگے بڑھ کر یہ سخت انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر آدمی اپنی رائے پر ضرورت سے زیادہ اصرار کرنے لگتا ہے۔ اختلاف رائے کے میں شدت سے برتنے لگتا ہے۔ دوسروں کے نقطہ نظر کو انصاف کے ساتھ نہ دیکھتا ہے، نہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ ہر مخالف رائے کو بدتر سے بدتر معنی پسنا کر ٹھکرانا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیز روز بروز اسے دوسروں کے لیے اور دوسروں کو

اس کے لیے ناقابل برداشت بنائی چلی جاتی ہے۔

اس مقام پر بھی بے اعتدالی رک جائے تو خیر سیتا ہے۔ لیکن اگر اسے خوبی سمجھ کر مزید پرسش کیا جائے تو پھر معاملہ بد مزاجی، اور چڑچڑے پن، اور تیز زبانی، اور دوسروں کی نیتوں پر شک اور حملوں تک پہنچ جاتا ہے جو کسی اجتماعی زندگی میں بھی نبھنے والی چیز نہیں ہے۔

ایک آدمی میسٹروں اختیار کرے تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہوگا کہ وہ اکیلا جماعت سے کٹ جائے گا اور اس مقصد کی خدمت سے محروم رہ جائے گا جس کی خاطر وہ جماعت سے وابستہ ہوا تھا۔ اس سے کوئی اجتماعی نقصان واقع نہ ہوگا۔ مگر جب کسی اجتماعی حیثیت میں بہت سے غیر متوازن ذہن اور غیر معتدل مزاج جمع ہو جائیں تو پھر ایک ایک قسم کا عدم توازن ایک ایک ٹولی کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ ایک انتہا کے جواب میں دوسری انتہا پیدا ہوتی ہے۔ اختلافات شدید سے شدید تر ہوتے جاتے ہیں۔ پھوسٹ پڑتی ہے۔ دھڑے بندی ہوتی ہے۔ اور اس کشش میں وہ کام خراب ہو کر رہتا ہے جسے بنانے کے لیے بڑی نیک نیتی کے ساتھ کچھ لوگ جمع ہوئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کام انفرادی کوششوں سے کرنے کے نہیں ہوتے، بلکہ جن کی نوعیت ہی اجتماعی ہوتی ہے، انہیں انجام دینے کے لیے بہر حال بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر کام کرنا ہوتا ہے۔ ہر ایک کو اپنی بات سمجھانی اور دوسروں کی بات سمجھنی ہوتی ہے۔ طبیعتوں کا اختلاف، قابلیتوں کا اختلاف، ذاتی خصوصیات کا اختلاف اپنی جگہ رہتا ہے۔ اس کے باوجود سب کو آپس میں موافقت کا ایک تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی تعاون ممکن نہیں ہوتا۔ اس موافقت کے لیے کسر و انکسار ناگزیر ہے۔ اور کسر و انکسار صرف معتدل مزاج کے لوگوں ہی میں ہو سکتا ہے جن کے خیالات بھی متوازن ہوں اور طبیعتیں بھی متوازن۔ غیر متوازن لوگ جمع ہو چکی جائیں تو زیادہ دیر تک جمورہ نہیں سکتے۔ ان کی جمعیت پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی، اور جن ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر ایک ایک قسم کے عدم توازن کے مریض جمع ہوں گے، انہیں پھر تفرقہ رونما ہوگا، یہاں تک کہ آخر کار ایک ایک امام مفسدوں کے بغیر ہی کھرا نظر آئے گا۔

جن لوگوں کو اسنادام کے لیے کام کرنا ہو، اور جنہیں جمع کرنے والی چیز اسلامی اصول پر نظام زندگی کی اصلاح و تعمیر کرنے کا جذبہ و دلولہ ہو، انہیں اپنا محاسبہ کر کے اس بے اعتدالی کی ہر شکل سے خود بھی بچنا چاہیے اور ان کی جماعت کو بھی یہ فکر ہونی چاہیے کہ اُس کے دائرے میں یہ مرض نشوونما نہ پائے۔ اس باب میں کتاب الشراذف سنت رسول اللہ کی وہ ہدایات اُن کے پیش نظر رہنی چاہئیں جو انتہا پسندی اور شدت سے منع کرتی ہیں۔ قرآن جس چیز کو اہل کتاب کی بنیادی غلطی قرار دیتا ہے وہ غلو فی الدین ہے (یَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ)، اور اس سے بچنے کی تاکید نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متبعین کو ان الفاظ میں فرماتے ہیں:-

ایاکم والغلو فاما هلك من كان قبلكم
بالغلو فی الدین -
خبردار! انتہا پسندی میں نہ پڑنا۔ کیونکہ تم سے پہلے کے لوگ دین میں انتہا پسندی اختیار کر کے ہی تباہ ہوئے

(مسند احمد بروایت ابن عباس)

ابن مسعود کی روایت ہے کہ حضور نے ایک تقریر میں تین بار فرمایا:-

هذک المتنظعون
اسم
برہاڑ ہو گئے شدت اختیار کرنے والے، ہمالیے اور نعمت سے کام لینے والے۔

دعوتِ محمدی کا امتیازی وصف اُس کے لانے والے نے یہ بتایا ہے کہ بُعثتُ بالحنيفية السمیة یعنی آپ پچھلی امتوں کی اذراط و تقریط کے درمیان وہ حقیقت لے کر آئے ہیں جس میں وسعت اور سعادت زندگی کے ہر پہلو کی رعایت ہے۔ اس دعوت کے علم برداروں کو جس طریقے پر کام کرنا چاہیے وہ اس کے داعی اول نے یہ سکھایا ہے:-

یسر واولا تعسر واولو بشر واولا تنفروا
سہولت دو، تنگ نہ کرو، بشارت دو، نفرت نہ دلاؤ۔
(بخاری و مسلم)

انما بعثتمو میسرین ولیرتبعثوا
تم سہولت دینے کے لیے بھیجے گئے ہو۔ تنگ نہ کرو۔

معسرین - (بخاری)

کے لیے نہیں بھیجے گئے۔

ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

تجھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

بین امرین قطُّ الا اخذ ایسرہما مالہ

دو معاملوں میں سے ایک کے اختیار کرنے کا موقع

یکن اثماً

دیا گیا ہو اور آپ نے ان میں سے آسان تر میں ناکو

(بخاری و مسلم)

نہ اختیار کیا ہو، الا یہ کہ وہ گناہ ہو۔

ان اللہ رفیق یحب الرفق فی الامر

اللہ نرم خو ہے، ہر معاملے میں نرم رویے کو پسند

(بخاری و مسلم)

کہتا ہے۔

من یحرم الرفق یحرم الخیر کلہ

جو نرم خوئی سے محروم ہوا وہ بھلائی سے بالکل محروم

(مسلم)

ہو گیا۔

ان اللہ رفیق یحب الرفق ویعطی علی

اللہ نرم خو ہے اور نرم خو آدمی کو پسند کرتا ہے۔ وہ

الرفق ما لا یعطی علی العنف وما لا

نرمی پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو شدت پر اور کسی دوسرے

یعطی علی ما سواہ (مسلم)

درستیہ پر عطا نہیں کرتا۔

ان جامع ہدایات کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ، اسلامی نظام زندگی کے لیے کام کرنے والے لوگ

اگر قرآن و سنت سے اپنے مطلب کی چیزیں چھانٹنے کے بجائے اپنے مزاج اور نقطہ نظر کو ان کے

مطابق ڈھالنے کی عادت ڈالیں تو ان کے اندر آپ سے آپ وہ توازن اور توسط و اعتدال پیدا

ہونا چلا جائے گا جو دنیا کے حالات و معاملات کو قرآن و سنت کے دیے ہوئے نقشے پر درست

کرنے کے لیے درکار ہے۔

بے اعتدالی مزاج سے ملتی جلتی ایک اور کمزوری بھی انسان میں ہوتی ہے جسے تنگ دلی کے نام

سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جسے قرآن میں ”شَحْنَفْس“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ

فلاح اس شخص کے لیے ہے جو اس سے بچ گیا (وَمَنْ يُّوقِ شَحْنَفْسَ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ)

اور جسے قرآن تقویٰ اور احسان کے برعکس ایک غلط میدان قرار دیتا ہے (وَ اَحْضَرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّعْرَ وَ اَنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا)۔ اس مرض میں جو شخص مبتلا ہو وہ اپنی زندگی کے ماحول میں دوسروں کے لیے کم ہی گنجائش چھوڑنا چاہتا ہے۔ وہ خود جتنا بھی پھیل جائے، اپنی جگہ اسے تنگ ہی نظر آتی ہے، اور دوسرے جس قدر بھی اس کے لیے سگڑ جائیں اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ برت پھیلے ہوئے ہیں۔ اپنے لیے وہ ہر رعایت چاہتا ہے، مگر دوسروں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کر سکتا۔ اپنی خوبیاں اس کے نزدیک ایک صفت ہوتی ہیں اور دوسروں کی خرابیاں محض ایک اتفاقی حادثہ۔ اپنے عیوب اس کی نگاہ میں قابل معافی ہوتے ہیں، مگر دوسروں کا کوئی عیب وہ معاف نہیں کر سکتا۔ اپنی مشکلات کو تو وہ مشکلات سمجھتا ہے، مگر دوسروں کی مشکلات اس کی رائے میں محض ہسات ہوتی ہیں۔ اپنی کمزوریوں کے جو الاؤنس وہ خود چاہتا ہے دوسروں کو وہ الاؤنس دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ دوسروں کی مجبوریوں کی پرہیزگاری بغیر وہ ان سے وہ انتہائی مطالبات کرتا ہے جو خود اپنی مجبوری کی صورت میں وہ کبھی پورے نہ کرے۔ اپنی پسند اور اپنا ذوق وہ دوسروں پر ٹھونسنے یا کوشش کرتا ہے۔ مگر دوسروں کی پسند اور ان کے ذوق کا لحاظ کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ یہ چیز ترقی کرتی رہے تو آگے چل کر خود وہ گیری و عیب جینی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ دوسروں کی ذرا ذرا سی باتوں پر آدمی گرفت کرنے لگتا ہے، اور پھر جو ابی عیب بتی پر مبتلا اٹھتا ہے۔

اسی تنگ دلی کی ایک اور شکل زود رنجی، تک چڑھا پن، اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنا ہے، جو اجتماعی زندگی میں اُس شخص کے لیے بھی مصیبت ہے جو اس میں مبتلا ہو اور ان لوگوں کے لیے بھی مصیبت جنہیں ایسے شخص سے واسطہ پڑے۔

کسی جماعت کے اندر اس بیماری کو کس آماج حقیقت میں ایک خطرے کی علامت ہے۔ اجتماعی جذبہ جمہور والہ اس کی بعثت اور باطنی تعاون چاہتی ہے، جس کے بغیر پارلیمانی بھی لڑ کر کام نہیں کر سکتے۔ مگر یہ تنگ دلی اس کے امکانات کو کم ہی نہیں، بسا اوقات ختم کر دیتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ تعلقات کی تلخی اور باطنی